

سماحی

جولائی، اکتوبر ۲۰۱۳ء / جلد نمبر ۱۱، ۱۲

اجبی

لاہور

جی میں کیا لیا ہے اپنے لئے ہم
پر سخن تاب لب نہیں آتا

♦ مسئلہ امامت، امارت اور خلافت

♦ استعمار، تاریخ اور ہماری فکر

♦ ”ریاست“ کا معاصر بیانہ!

مدیر: محمد دین جوہر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جی
محمد دین جوہر

مشمولات

جولائی، اکتوبر ۲۰۱۳ء / جلد نمبر ۱۱، ۱۲

۳	مدیر کے نام
۷	حرف مراد: استعمار، تاریخ اور ہماری فکر محمد دین جوہر
۱۰	بانگ استعمار کا استمرار محمد دین جوہر
۱۶	استدراک نادر عقیل انصاری
۲۱	ہم عصر دنیا اور ہماری صورت حال احمد جاوید
۲۷	اسلام اور ریاست: جوانی بیانیہ پر ایک نظر محمد دین جوہر
۴۹	آیہ ”فان تبتم فہو خیر لکم“ نادر عقیل انصاری
	قبائلیوں کی تحلیل اور نسل کشی، ڈیوڈ سٹینرڈ
۹۷	ترجمہ: نادر عقیل انصاری
	صدر ضیاء الحق، افغان جہاد اور غامدی صاحب کا ”بیانیہ“
۱۱۵	نادر عقیل انصاری
۱۳۱	اسلام تراویس ہے تو مصطفوی ہے اور یا مقبول جان
۱۳۵	”ریاست“ کا معاصر بیانیہ نادر عقیل انصاری
	”ریاست“ کے قلب پر ضرب کاری؟ امبرٹو لیکو
۱۸۹	ترجمہ: نادر عقیل انصاری
۱۹۵	مسئلہ امامت، امارت اور خلافت مولانا محمد ایوب دہلوی
۲۱۹	غزل احمد جاوید
۲۲۰	غزل سعود عثمانی
۲۲۱	اسباق احمد جاوید
۲۲۳	۲۳۔ فلاطینوس۔ ۴



مدیر
محمد دین جوہر



نائب مدیر
نادر عقیل انصاری



مجلس ادارت
کاشف علی خان شیروانی
ڈاکٹر فخر چات
شاہ محمود



© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ضروری نوٹ:

اس شمارے میں قرآن حکیم کی آیات بھی شامل ہیں۔ ان کی درستی پر بساط بھر
توجہ دی گئی ہے لیکن اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو براہ کرم ادارے کو مطلع فرمائیں۔

سٹی لائبریری لاہور ملنے کا پتہ:

کتاب مجلس
در بارہ کتب لاہور

محمد فہد : 0321-8836932

برائے رابطہ، اظہار رائے واستفسار:

quarterlyjee@gmail.com

قیمت: ۱۵۰ روپے

قانونی مشیر:

کامنز لا کمپنی، نوائے وقت بلڈنگ، ہم شارع فاطمہ جناح، لاہور

Commons Law Company, Nawa-e-Waqt Building
4-Shar'i Fatima Jinnah, Lahore

صدر ضیاء الحق، افغان جہاد، اور غامدی صاحب کا ”بیانیہ“

نادیر انصاری



جدید اسلام غالب قوت کا زائیدہ ہے۔ اور قوت کا علم سے گہرا تعلق ہے۔ مثل فوکو نے کہا تھا کہ معاشرے اور تاریخ میں جاری گفتگو (discourses) اور بیانیے (narratives) قوت کی مصنوعات ہوتے ہیں۔ جو علم معاشرے میں کھلے عام میسر ہے، اس سے زیادہ لائق مطالعہ وہ علم ہے جو غیر موجود ہے، مفقود ہے، فنا کر دیا گیا ہے۔ قوت غیر مطلوب حقائق کو کئی طریقوں سے دفناتی ہے: ممانعت و تحریم (taboo) سے؛ اغماض سے گویا وہ حقائق سرے سے موجود ہی نہ ہوں یعنی ان پر (nonexistence) طاری کر کے؛ اور سکوت (silence) کے ذریعے یعنی حقائق پر خاموشی مسلط کر کے۔ چونکہ ماڈرن اسلام ہمیشہ تاریک استعماری قوتوں کے ساتھ ایک ناجائز تعلق میں بندھا رہا ہے، لہذا وہ بھی ان آفات کا شکار ہے۔ اس میں تنویر کم اور نقاط کور (blind spots) زیادہ ہوتے ہیں۔

جب قرآن مجید اور احادیث مطہرہ کو مغربی استعمار، نو استعمار، اور جدید ”ریاست“ کی قوت و طاقت کی گاڑی میں جوت دیا جائے تو کیسی کیسی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، اس کا اندازہ جاوید غامدی صاحب کے ”بیانیے“ سے بھی ہو رہا ہے، جس میں جہاد کے دینی بیانیے کو ایک افسانوی بیانیہ بتایا گیا ہے۔ حکم جہاد اسلام کے بنیادی اور ابدی احکام میں سے ہے۔ اس کے انکار کی لہر استعمار کے دوران اٹھی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مسلمان ناکام رہے، لیکن وسیع پیمانے پر اس مسلح مزاحمت نے برطانوی استعمار کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں، اور استعمار پر جہاد کا ایک مہیب خوف مسلط ہو گیا تھا۔ استعمار مزاحمت کے جواب ہی میں تشدد کے استعمال کا قائل نہیں ہے، وہ مزاحمت کو بلکہ مزاحمت کے ارادوں کو بھی شل کر دینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاد کا خیال اس کے لیے پریشان کن تھا۔ استعمار کی برکت تھی کہ کئی متجددین اٹھے اور انہوں نے جہاد کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے

کے لیے ”نصوص“ پر مبنی اپنی اپنی تعبیرات پیش کیں، جن میں سرسید احمد خاں، مرزا غلام احمد قادیانی، اور مولوی چراغ علی سب سے نمایاں تھے۔ لیکن یہ تعبیرات وزنی دلائل سے رد کردی گئیں اور انکارِ جہاد ایک قصہ پارینہ ہوا۔ سنہ ۲۰۰۱ء کے بعد انکارِ جہاد کی تحریک پھر سے زندہ ہوئی۔ دہشت گردی کی حالیہ لہر کو بنیاد بنا کر، اب دین کے بنیادی احکام کے انکار کا وہ پرانا خواب پورا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جو سب سے پہلے استعمار کے زمانے میں مغرب نے دیکھا تھا۔ اس خواب کی تعبیر میں بہت کچھ رنگ تو سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، اور مرزا غلام احمد قادیانی ہی بھر چکے تھے، لیکن ان کے بعد بھی، سچ یہ ہے کہ جدید اسلام کا کوئی متکلم اس گناہ کے ارتکاب سے بچ نہیں سکا۔ سنہ ۲۰۰۱ء کے بعد حالات انکارِ جہاد کے لیے یکایک سازگار ہو گئے۔ دہشت گردی کی مذمت کی آڑ میں مغربی قوتوں نے سرے سے جہاد ہی کو مطعون کرنا شروع کر دیا، اور مستشرقین اور خود مسلمانوں میں تجدد پسند صحافیوں کا ایک انبوہ اس مقصد کے لیے سرگرم ہو گیا۔ سلیم احمد کا شعر ہے:

لوگ کہتے ہیں ہوس کو بھی محبت جیسے

نام پڑ جائے مجاہد کسی بلوائی کا

جاوید غامدی صاحب جیسے میڈیا پر فارمر اسی تبلیغ میں مبتلا ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے یہ بڑی ریاضت اور دراز نفسی سے دہشت گرد کو ”مجاہد“ ثابت کرتے ہیں، پھر جہاد کی مذمت میں یاد کی ہوئی ایک تقریر اُگل دیتے ہیں۔ ایک طویل فہرست ہے ان اہل قلم کی جو صبح شام اس کوشش میں لگے ہیں کہ جہاد کا دھبہ مسلمانوں کے دامن سے دھو دیں، اور اسلام کو بدھ مت سے زیادہ ”اہنسا“ کا پرچارک ثابت کر دکھائیں! چونکہ جاوید غامدی صاحب بھی جہاد لاعلائے کلمۃ الحق کے منکر ہیں، لہذا وہ بھی اس وقت دہشت گردی اور جہاد کو ایک ہی لائٹھی سے ہانک رہے ہیں، کہ دہشت گردی کے اسناد کے پردے میں جہاد کا بھی کچھ بندوبست ہو سکے۔ اس عہد زرگری میں مسلمانوں میں جہاد کا کچھ زیادہ جذبہ ویسے بھی باقی نہیں رہا، لیکن جو کچھ باقی ہے، یہ متجددین حالات کی خرابی سے فائدہ اٹھا کر اسے ”دہشت گردی“ کی آڑ میں حرام بتا رہے ہیں:

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

اسلام کے احکام جہاد ہمیشہ سے متجددین کے لیے سواہن روح بنے رہے ہیں، اور یہ لوگ اس کی تردید و انکار کے لیے بہت دور دور کی کوڑیاں لاتے رہے ہیں۔ بدلتے حالات کے ساتھ جدید اسلام کی جہادی تعبیرات بھی رنگ بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں جدید اسلام علمی دیانت کے اصولوں کی کیسی خلاف ورزی کا مرتکب ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہو اجب جاوید غامدی صاحب نے گزشتہ برس افغان جہاد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ ارشادات فرمائے۔ ایک سائل، ڈاکٹر الطاف قادر صاحب، نے مطالبہ کیا:

”جن لوگوں نے افغان جہاد کی سرپرستی کی، اور قبائلی علاقے کے لوگوں کو استعمال کیا، ان لوگوں کو سزا دی جائے۔“

اس پر جاوید غامدی صاحب فرماتے ہیں:

مجھے ان سے سو فیصد اتفاق ہے۔ میرے نزدیک اصل جرم کا ارتکاب امریکہ نے کیا، اور پھر ہماری اُس وقت کی اسٹیبلشمنٹ نے کیا۔ اُن کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس قسم کی پرائیویٹ آرمی بنائیں، اور مذہبی بنیاد پر لوگوں کو منظم کریں اور ان کے ذریعے سے جہاد فرمائیں۔ افغانستان میں بھی اور کشمیر میں بھی۔ دونوں جگہ یہ بنیادی غلطی کی گئی۔ میں نے اس زمانے میں بھی بڑی شدت کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلائی تھی، کہ ہم اپنے وجود میں بارود بھر رہے ہیں اور اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ — اور میں یہ بات درست سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس طرح کی پالیسیاں بنائیں، ان کی مذمت کی جانی چاہیے۔ — میں نے اپنے کانوں سے یہ سنا ہے کہ ہلیری کلنٹن نے کہا کہ [افغان جہاد میں] ہم سے غلطی ہوئی [اور] ہم نے سارے معاملے کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا۔ جو کچھ ڈاکٹر الطاف کہہ رہے ہیں، میں بھی ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں۔ — بجائے اس کے کہ ہم ان قبائلیوں کو جدید ریاست میں منظم کرتے، ہم نے انہیں اس کام کے لیے استعمال کیا۔ — جنہوں نے یہ کام کیا وہ سرتاسر مجرم ہیں۔ — میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں۔^۲

”میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں“ — اس جملے کی گردان ہر سامع و قاری کو چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک سانس میں تین مرتبہ فرماتے ہیں کہ ”میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں“ اور زور دیتے ہیں کہ ”میں نے اُس زمانے میں بھی بڑی شدت کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلائی تھی“۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ ہونہ ہو، اس کے پیچھے ضرور کوئی رمز ہے! ضرور کسی شے کی پردہ داری مطلوب ہے! جواب دینے سے زیادہ، مقرر کو اس بات کی فکر کیوں ہے کہ سامعین کو باور کرائے کہ: میں کبھی اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ لہذا جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ سرتاسر مجرم ہیں۔ میں نہیں ہوں!

اگر جاوید غامدی صاحب کی اس تقریر میں ان کا موقف مبرہن ہو گیا ہے، تو اُن ہی کی درج ذیل مطبوعہ تحریر بھی لائق مطالعہ ہے، جو انہوں نے سنہ ۱۹۸۸ء میں صدر ضیاء الحق کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھی تھی۔ ہم اس تحریر کو بہام و کمال نقل کر رہے ہیں تاکہ غور و فکر کرنے والوں پر اور بعض سادہ لوح پاکستانیوں کو معلوم ہو جائے کہ جدید اسلام کے ”بیانیے“ سے کیا مراد ہے، اور جس ”جوابی بیانیے“ کے

۲۔ سماء ٹی وی، ”غامدی کے ساتھ“، ۲۸/ فروری، سنہ ۲۰۱۴ء۔

پیچھے اب جاوید غامدی صاحب کھڑے ہیں، وہ دراصل کس ”بیانیہ“ کا جواب ہے، اور اُن کے حالیہ بیانیے سے جو کچھ متبادر ہے، اس کے مقابل ان کا اصل ”بیانیہ“ کیا ہے! تاکہ واضح ہو جائے کہ جدید اسلام کا اصل بیانیہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں، بلکہ نو استعماریات، اور ”ریاست“ کی قوت کے بارے میں ہے! اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان میں موجودہ ”مذہبی انتہا پسندی“ کی لہر کس پردہ نشیں کا ”مولودِ فسانہ“ ہے! غامدی صاحب کی تحریر پیش ہے:

شذرات

جاوید احمد غامدی

صدر جنرل محمد ضیاء الحق بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات ہماری تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش سانحہ ہے۔ نفاذِ دین کے لیے جو حکمتِ عملی انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اختیار کیے رکھی، مجھے اگرچہ اس سے سخت اختلاف تھا لیکن ابھی پچھلے ماہ میں نے جب ”شریعت آرڈی نینس“ کے نفاذ کے بعد ان کی حکمتِ عملی پر تنقید لکھی تو اس میں یہ بھی لکھا: ”مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ بہر حال اس ملک کی تاریخ میں پہلے سربراہِ مملکت ہیں جنہوں نے اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کو بغیر کسی معذرت کے پورے اعتماد کے ساتھ ظاہر کیا۔ اسے برملا اس مملکت کی اساس قرار دیا۔ اس کے بارے میں صاف صاف کہا کہ وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری ریاست کا بھی دین ہے۔ اپنی سربراہی کے پہلے دن سے اس کے نفاذ کے لیے کوشاں ہوئے۔ علماء اور اہل دین کے ساتھ بہت عقیدت مندانہ رویہ اختیار کیا۔ ہر قومی اور بین الاقوامی پلیٹ فارم پر، جہاں انہیں موقع ملا، وہ قرآن کی آیات پڑھتے اور اسلام پر اپنے غیر متزلزل یقین کا اظہار کرتے نظر آئے، اور اس ملک میں جہاں اکثر اربابِ سیاست اب بھی اس حماقت میں مبتلا ہیں کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے اور ریاست کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اس تصور کی یخ کنی کرتے رہے۔“

صدر صاحب کی وفات کے بعد اب اس ملک کے در و دیوار ان حقائق کا اعتراف کر رہے ہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا یہ بطلِ جلیل ہمارے دشمنوں کے

انقام ہی کا نشانہ بنا۔ اس کے مقابلے میں پے درپے ہزیمت اٹھانے کے بعد ان کے لیے کوئی دوسرا راستہ غالباً باقی بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن انہیں شاید معلوم نہ تھا کہ اس طرح وہ اس قوم کی تاریخ میں ایک ایسا باب رقم کر رہے ہیں جو اس کے نصب العین کی تلاش میں اب ہمیشہ اس کے لیے منبع الہام بنا رہے گا۔ اقبال نے عالمگیر کے بارے میں کہا تھا:

ترکش مارا خدنگ آخریں

[یعنی اورنگ زیب عالمگیر ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا]۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو محمد ضیاء الحق، فی الواقع اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں ہمارے ترکش کا پہلا تیر تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے ہم نے ان سے اختلاف بھی کیا اور ان پر تنقید بھی کی، لیکن ان کی شہادت نے اب اس کے سوا کوئی احساس باقی نہیں رہنے دیا کہ:

یار در عہد شبابم بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت
وہ کیا شخص تھا، بقول شبلی:

اس کے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار
وہ شکر ریز تبسم، وہ متانت وہ وقار
وہ وفا کیشی احباب، وہ مردانہ شعار
وہ دل آویزی خو، وہ نگہ الفت بار
صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کی ابرو پہ شکن آ کے پلٹ جاتی تھی

یہ قوم ان کی ہر بات فراموش کر دے سکتی ہے، لیکن جہاد افغانستان کے معاملے میں وہ جس طرح اپنے موقف پر جمے رہے اور جس پامردی اور استقامت کے ساتھ انہوں نے فرزندانِ لینن کے مقابلے میں حق کا علم بلند کیے رکھا، اسے اب زمانے کی گردشیں صبح نشور تک ہمارے حافظے سے محو نہ کر سکیں گی۔ میں جب فیصل مسجد کے بلند و بالا میناروں کے سایے میں ان کے مرقد کو دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار اپنے وہ شعریاد آ جاتے ہیں جو میں نے اب سے برسوں پہلے، غالباً ۱۹۷۳ء میں شہادت گاہ بالا کوٹ کی زیارت کے موقع پر کہے تھے:

فضا خموش، سواد فلک ہے تیرہ و تار
کہ لٹ گئی ہے کہیں آبروئے چرخ بریں

نگاہ قلب کے تاروں میں اختلال سرود
مرے وجود میں شاید مرا وجود نہیں
شروع وادی کاغان میں مقام جنوں
مقام حاصل انساں، مقامِ اِلاّ ہو
مری حیات پریشاں کی رفعتوں کا مقام
مری قبائے دریدہ کی آرزوئے رفو
یہی مقام ہے اس قافلۂ حق کا مقام
گواہ جس کی شہادت پہ عصمتِ جبریل
مری نگاہ تمنا کی جستجو کا کمال
نواحِ مشہد احمد، مقامِ اسماعیل
میں اس مقام کے ذروں کو آسماں کہہ دوں
اور اپنی منزل فردا کے رازداں کہہ دوں

ستمبر سنہ ۱۹۸۸ء۔^۳

جاوید غامدی صاحب کا یہ ”بیانیہ“^۴ کس قدر چشم کشا ہے! اور یہ کلام ہمارے علم کے ایوانوں اور اہل قلم کی

۳۔ جاوید احمد غامدی، ”شذرات“، ماہنامہ اشراق، جلد ۱، شمارہ ۱، ستمبر ۱۹۸۸ء، صفحات: ۸۳-۸۴۔

۴۔ اس تحریر میں ہم ”افغان جہاد“ اور اس کی تاریخ پر اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کر رہے، اور انکارِ جہاد کی اس حکمتِ عملی کو محض اعتباراً ”بیانیہ“ لکھا ہے۔ لیکن دین میں تجدّد کے علم بردار ایک صحافی، خورشید ندیم اسے حقیقتاً بیانیہ سمجھتے ہیں۔ طاقت کے کھیل میں کواکب کچھ ہوتے ہیں، نظر کچھ آتے ہیں، بلکہ جو ”کواکب“ سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے، وہ بھی کچھ کچھ نظر آنے لگتے ہیں! خورشید ندیم لکھتے ہیں:

”مذہبی تشدد پسندی اُس بیانیے کا منطقی نتیجہ تھا جو ہزل خیاں الحقی مرحوم سے منسوب ہے۔ جب ریاست خود مذہب کے نام پر گروہوں کو مسلح کرتی ہے تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے جو ہوا۔“ (کالم ”فوج اور اہل سیاست“، روزنامہ دنیا، مورخہ ۱۶ مارچ، سنہ ۲۰۱۵ء)۔

خورشید ندیم کے کئی کالم ”سماج“ کے اخلاقی زوال کے مرتبے پر مبنی ہوتے ہیں، اور سماج کی اصلاح کی ذمہ داری سے بوجھل ہوتے ہیں۔ مذہبی تشدد پر تو اپنا صحافی قلم تیز کرتے انہیں ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اہل مذہب کی اصلاح کا جذبہ بھی ان کے لفظ لفظ میں موجزن ہے۔ لیکن صحافت کی اخلاقی اصلاح اس واعظانہ پراجیکٹ کا حصہ نہیں ہے۔ صحافت کو اصلاح سے مستثنیٰ رکھنے کا جواز بھی ہے۔ کارپوریٹ صحافت کی مجبوریاں ہوتی ہیں، کیونکہ یہ ہمیشہ قوت کے تابع ہوتی ہے۔ صحافت غالب episteme، اور ریاستی قوت کے قرآن (intersection) کی دربان ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی اسی بہاؤ میں بہتی ہے جس میں مصنوع نظریات بہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خورشید ندیم شاید اس کی قدرت نہیں رکھتے کہ پوری بات بیان کریں۔ یہ جدید صحافت کا رضا کارانہ سنسر ہے۔ جو ”بیانیہ“ مبینہ طور پر پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور تشدد کا سبب بنا ہے، اس کے مصنفین میں خورشید ندیم کے استاد

نفاہت کے کس کس گوشے تک نواستعمار کی رسائی کا عکاس ہے! جس ”اسٹیبلشمنٹ“ کو جاوید غامدی صاحب آج ”مجرم“ قرار دے رہے ہیں، اُس وقت انہیں ”امت مسلمہ کے ترکش کا پہلا تیر“ دکھائی دے رہی تھی، اور ساتھ بے باکی سے یہ بھی فرما رہے ہیں کہ ”میں نے اُس وقت بھی شدت سے توجہ دلائی تھی کہ ہم اپنی قبر کھود رہے ہیں!“

جب مغربی قوتوں کو ضرورت پڑی کہ افغانستان میں در آنے والی روسی افواج کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جائے، تو وائٹ ہاؤس کے ساتھ ساتھ، جاوید غامدی صاحب بھی اس ”بطل جلیل“ کی ”امامت“ میں جہاد کے ثنا خواں تھے۔ آج جب مغربی قوتوں کے خلاف افغان مزاحمت کا سوال اٹھا ہے، تو وہ سب لوگ ”مجرم“ قرار پائے ہیں۔ یہ ”ریاست“ کے استبداد کا فیض نظر تھا، یا اس کے پیچھے مکمل پہنچانے والے مغربی مکتب کی کرامت تھی، کہ جاوید غامدی صاحب نے افغان جہاد کو ”فرزندانِ لیسن“ کے مقابل ”حق کا علم“ قرار دیا؟ اور آج وہ انہی مجاہدین کو ریڈ انڈین قبائل کی طرح ”تحلیل“ کر دینے کے داعی بن گئے ہیں؟^۵ اس ”منسوخ“ بیانیے کا گہرا تعلق سنہ ۲۰۱۵ء کے ”جوابی بیانیے“ سے بھی ہے۔ ”جوابی بیانیے“ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ”ریاست کا کوئی دین نہیں ہوتا۔“ لیکن یہ رفعت صدر ضیاء الحق کے عہد کی من جملہ برکات ہی سے ہو سکتی ہے کہ جاوید غامدی صاحب نے لکھا تھا کہ اسلام ”جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری ریاست کا بھی دین ہے۔“ اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ جو لوگ اسلام کو ”ریاست“ کا دین تسلیم نہیں کرتے (یعنی جو لوگ جنرل ضیاء الحق سے اختلاف کر رہے تھے)، وہ ”حماقت میں مبتلا“ ہیں!

لیکن جدید اسلام کے فتاویٰ کی صنعت، اور جدیدیت کی mass production کی صنعت کے مابین فقط یہی مناسبت رُو عمل نہیں ہے۔ اب حفظ و نسیاں بھی اسی پیداواری نظام کے طلسم میں گم ہیں۔ اُس وقت

جاوید غامدی صاحب بھی شامل ہیں، لیکن خورشید ندیم کی صحافیانہ تحریریں اس معاملے میں Journalistic Amnesia کا شکار ہیں، چنانچہ جاوید غامدی صاحب کا ”افغان جہاد“ سے قدیم تعلق خورشید ندیم کا blind spot بن کے رہ گیا ہے۔ نصابی کتابوں میں مرقوم ”پییشہ ورانہ صحافتی اخلاقیات“ کے قواعد و ضوابط بھی اسی blind spot کے اندھیرے میں گم ہیں۔ ورنہ وہ کبھی تو لکھتے کہ ان کے استاد نے افغان جہاد کی سعادت کی وجہ سے صدر ضیاء الحق کو ”امت مسلمہ کے ترکش کا پہلا تیر“ قرار دیا تھا، اور ”قافلہ حق“ کا معزز لقب دیا تھا! کبھی تو ”فکرِ فراہی“ کے ”new religious cult“ کی عصبيت سے بلند ہوتے، اور صدر ضیاء الحق کے خلاف قراردادِ جرم مرتب کرتے وقت اپنے ”استاذِ امام“ کے لیے بھی دولفظ لکھتے، اور ”مذہبی تشدد“ کے فروغ میں جاوید غامدی صاحب کے تاریخی کردار پر بھی کچھ روشنی ڈالتے، اور بتاتے کہ ”مذہبی تشدد پسندی اس بیانیے کا نتیجہ تھا جو جاوید غامدی سے منسوب ہے!“ کبھی تو کہتے کہ یہ ”مذہبی تشدد“ ان کے اپنے استاد کا ”مولودِ فسانہ“ ہے! لیکن قوت کی حرکات، جبر کے تماشے، اور کارپوریٹ جنت میں، منصور جیسی ہمت کے بغیر، یہ حق گوئی بھلا ممکن ہے؟ اور وہ بھی ایک ایسے قلم کار کے لیے جو جدید اسلام کا مجتہد اور فقہ الاستعمار کا مقلد ہو؟ دیکھ تو اپنا عمل تجھ کو نظر آتی ہے کیا/ وہ صداقت جس کی بے باکی تھی حیرت آفریں! ۵۔ قبائلی آبادی کو ”تحلیل“ کرنے اور ان کی ”طاقت کو توڑنے“ کے حق میں جاوید غامدی صاحب کے پالیسی بیان کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں اسی شمارے میں، راقم کا مضمون: آیہ ”فان تبتم فهو خیر لکم“۔

افغان حریت پسندوں کی تلوار روسی افواج کی گردن پر تھی۔ دس بارہ برس بعد جب جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں، خود امریکہ کے خلاف افغان مزاحمت شروع ہوئی تو ایک صبح جاوید غامدی صاحب نے دیکھا کہ اب حریت پسند افغانوں کی نوکِ شمشیر، ”فرزندِ انِ لینن“ کی بجائے امریکی اور یورپی افواج کے سینے میں بیہوش تھی۔ وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون اب کچھ اور کہہ رہے تھے: اب یہی مجاہدین ”دہشت گرد“ قرار پائے تھے۔ چنانچہ جس جہاد کے بارے میں جاوید غامدی صاحب کا خیال تھا کہ اسے ”زمانے کی گردِ شیں صبحِ نشور“ تک ان کے حافظے سے محو نہ کر سکیں گی، وہ دس بارہ سالوں میں ہی غامدی صاحب کے حافظے سے محو ہو گیا۔

خواہ غامدی صاحب ہر بات بھول گئے ہوں، لیکن پاکستان کے لوگ صدر ضیاء الحق کی روایات کو نہیں بھولے۔ ضیاء الحق صاحب نے کراچی میں جس لسانی انتہا پسند تنظیم کی بنیاد رکھی وہ ضیاء الحق صاحب کو کہاں بھولنے دیتی ہے؟ جاوید غامدی صاحب نے حال ہی میں اپنے ایک ”بیانیہ“ کی ابتدا اس مفروضے سے کی ہے کہ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا اصل منبع ہمارے دینی مدارس ہیں اور یہ رجحان ہمارے دینی مدارس کا ”مولودِ فسانہ“ ہے۔ معلوم ہے کہ مغرب کا اگلا ہدف پاکستان میں دینی تعلیم کا نظام ہے، جسے وہ لارڈ میکالے کے قائم کردہ سیکولر نظامِ تعلیم میں ”تحلیل“ کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن غامدی صاحب کا یہ دعویٰ حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں سب سے بڑے پیمانے پر جو دہشت گردی ہوئی وہ مشرقی پاکستان اور کراچی کے لسانی فسادات کے واقعات تھے۔ اس کے بعد کراچی میں گزشتہ تیس برس میں، اور اب بلوچستان میں ہونے والی قتل و خونریزی لاکھوں مسلمانوں کی جان لے چکی ہے۔ صرف کراچی میں گزشتہ تیس برس سے روزانہ دس پندرہ مقتولوں کے جنازے اٹھتے ہیں۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں، بلوچستان میں، اور کراچی میں۔ لسانی اور صوبائی دہشت گرد تنظیموں کے بانی، صفِ اول کے قائدین، اور پیشہ ور قاتل، اور بھتہ خور۔ سب سیکولر سکولوں اور کالجوں سے ڈگریاں لے کر نکلے تھے۔ لہذا دہشت گردی کا یہ رجحان، جس کے سامنے طالبان کی دہشت گردی بیچ ہے، جدید سیکولر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ”مولودِ فسانہ“ ہے۔ لیکن غامدی صاحب کا غیظ و غضب جس طرح دینی مدارس کے خلاف بھڑکا، اس طرح کا کوئی وعظ سیکولر تعلیم کے خلاف جاری نہیں ہوا۔ کیا اب وہ جدید تعلیمی اداروں کی حالت پر بھی وہی غیظ و غضب دکھائیں گے جو

۶۔ صدر ضیاء الحق کے مرقد کے بارے میں جاوید غامدی صاحب نے کہا تھا: میں اس مقام کے ذروں کو آسمان کہہ دوں / اور اپنی منزل فردا کے رازداں کہہ دوں۔ غالباً ”فردا“ سے ان کی مراد مستقبل قریب ہی تھا، یعنی یہی کوئی دس بارہ برس! اور اس کے بعد ان کی نئی منزل ”Enlightened Moderation“ تھی، اور ہر مرتبہ بظاہر دین کی ”تجدید“ ہی کا اڈا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے متحد دین سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید / مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ!

۷۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں ایک اور قسم کا غیر انسانی episteme غلبہ پارہا ہے۔ محترم احمد جاوید صاحب فرماتے ہیں: جدید تعلیم کے اداروں میں مغرب کی سطحی اور بے سرو پائلی کا جنون جس طرح پھیل رہا ہے، اس پر ابھی

مدارس پر بات کرتے ہوئے ان کے کلام کا خاصہ ہوتا ہے، یا کراچی کی لسانی دہشت گردی پر خاموشی کی وہی پالیسی برقرار رکھیں گے جو اب تک رکھی ہے؟ کیا اس خاموشی کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ جس دہشت گردی کی امریکہ اور برطانیہ مذمت کریں ہمارے واعظین بھی اسی کی مذمت کرتے ہیں، اور جس مافیا اور دہشت گرد تنظیم کی مبینہ پشت پناہ مغربی قوتیں ہوں، ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمارے واعظین کو سانپ سونگھ جاتا ہے؟^۸ چونکہ کراچی میں لسانی سیاست کی سرپرستی کرنے والوں میں بھی صدر ضیاء الحق کا نام آتا ہے، لہذا اس ”سیکولر“ دہشت گردی پر خاموشی کی وجہ کیا ہے؟ جاوید غامدی صاحب کا صدر ضیاء الحق کے ساتھ یہ قدیم فکری تعلق تو اس خاموشی کی وجہ نہیں؟ کیا کراچی کی لسانی دہشت گردی بھی دینی مدارس کا ”مولود فسانہ“ ہے؟ غامدی صاحب کے خیال میں کیا صولت مرزا^۹ نے کسی دینی مدرسے سے درس نظامی کیا ہوا ہے؟^{۱۰}

اپنے حالیہ بیانیے میں جاوید غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی اور قتل و غارت کا عنقریب ”اسی مذہبی فکر کا مولود فسانہ ہے جو نفاذ شریعت اور جہاد و قتال کے زیر عنوان اور کفر،

سے قابو نہ پایا گیا تو دہشت گردوں کی ایک نئی قسم وجود میں آئے گی، جو ہماری تہذیب اور معاشرت کی اُن رہی سہی بنیادوں کو بھی ڈھادے گی جنہیں دہشت گردی کا مولود طوفان نہ گراسکا!

۸۔ غامدی صاحب جہاں ”مذہبی انتہا پسندی“ پر تقریریں فرما کر ہلکان ہوئے جارہے ہیں، وہاں انہوں نے کراچی کی لسانی دہشت گردی کے معاملے پر سختی سے خاموشی کی پالیسی برتی ہے۔ جارج آر ویل (George Orwell, 1903-1950) نے کہا تھا کہ سنسر کاسب سے زیادہ مذموم پہلو یہ ہے کہ یہ اکثر اوقات رضا کارانہ اپنے اوپر نافذ کیا جاتا ہے! اس کی ایک مثال ابھی خورشید احمد ندیم کی صحافت سے بھی پیش کی گئی ہے۔

۹۔ صولت مرزا، متحدہ قومی مومنٹ کا سرگرم کارکن اور کل وقتی اجرتی دہشت گرد اور قاتل، جس نے ۵۸ سے زائد قتل کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ گرفتاری کے بعد دہشت گردی کے ایک واقعے میں اعلیٰ ترین عدالت نے اس کی سزائے موت بحال رکھی، اور ۱۲ مئی سنہ ۲۰۱۵ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ اپنے اعترافی بیان میں کہتا کہ ”ہم لوگ قائد تحریک کو نبی ﷺ کا ہم رتبہ خیال کرتے تھے“، نعوذ باللہ من ذلک۔ بس یہی وہ موقع ہے جب وہ اپنے اقبالی بیان کے دوران اپنا منہ چھپا لیتا ہے، اور رونے لگتا ہے۔ پھر یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس غرض سے قائد تحریک کے ”معجزات“ کی خبریں پھیلائی گئیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ چاند میں الطاف حسین کی شبیہ نظر آئی ہے!

۱۰۔ چونکہ حال ہی میں بڑی بڑی دہشت گردی کی وارداتوں کے جو طزم گرفتار ہوئے ہیں ان میں جدید اداروں کے تعلیم یافتہ انجینئیر وغیرہ بھی شامل ہیں، لہذا اب اس نکتے سے زیادہ دیر تک اغماض برتنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ خورشید احمد ندیم صاحب، جن کا ذکر ابھی ہوا ہے، اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی بڑی دلچسپ توجیہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید تعلیمی ادارے بھی مدارس کی فکر کے چنگل میں آچکے ہیں! (”جامعات اور دہشت گردی“، ۲۳ / مئی، سنہ ۲۰۱۵ء) اس استدلال پر تبصرہ کرنے کی بجائے اس کے طریقہ نامہ پہلو سے حظ اٹھانا زیادہ ضروری ہے، اور یہ بھی کہ وہ نادانستہ مدرسانی نظام تعلیم کی کارکردگی کو خراج تحسین بھی ادا کر رہے ہیں۔ انہیں جدید تعلیم کے متشددانہ پہلوؤں کا کوئی ادراک نہیں ہے، اور نہیں جانتے کہ دنیا کی تاریخ میں تشدد کے سب سے زیادہ ہولناک مناظر جدید مغرب نے ہی پیش کیے ہیں، اور جدید تعلیم کے مہلک اثرات کی جانب ہمارے محترم احمد جاوید صاحب نے اشارہ کیا ہے، جسے ابھی نقل کیا گیا (دیکھیے حاشیہ: ۷)۔ جدید استعماری اسلام کے لیے سوال وہی ہے جس کا سامنا کرنے سے وہ دانستہ اغماض برت رہا ہے کہ: صولت مرزا کس مدرسے سے فارغ التحصیل تھا؟ کس مدرسے کا ”مولود فسانہ“ تھا؟ کس ”انتہا پسند مذہبی“ فکر سے دہشت گردی کا الہام پاتا تھا؟

شرک، اور ارتداد کے استیصال کے لیے ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ انتہا پسند افراد اور تنظیمیں اسی سے الہام حاصل کرتی ہیں“^{۱۱}۔ لیکن اب جاوید غامدی صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی دراصل افغان جہاد کا ”مولودِ فسانہ“ ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہبی انتہا پسندی کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوئی، نہ کسی مذہبی مدرسے سے اٹھی ہے، بلکہ یہ تو ”امریکہ اور اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ“ کے جرائم کا نتیجہ ہے اور خود جاوید غامدی صاحب کی دینی صحافت کا ”مولودِ فسانہ“ ہے جس کی پیدائش سنہ ۱۹۸۸ء میں ہوئی تھی، جسے غامدی صاحب نے اپنے ہاتھ سے سیاسی اسلام کی گھٹی پلائی تھی، جس کے عقیقے پر جاوید غامدی صاحب نے تنہیتی شاعری فرمائی تھی، اپنے قلم سے اس کی لے بڑھائی تھی، اور اس کی غیر مشروط تائید فرمائی تھی۔ اب وہ دہشت گردی عالم شباب کو پہنچی ہے تو غامدی صاحب اسے بھلانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ وہ کب تک امریکہ اور صدر ضیاء الحق کے ”جرائم“، اور اپنے صحافتی گناہوں کا بوجھ دینی مدارس پر لادتے رہیں گے؟ اپنی جان بچانے کے لیے وہ ”حاکمیتِ قرآن“ کو کیوں پس پشت ڈال رہے ہیں؟ قرآن مجید میں تو آیا ہے: **الَّا تَذَرُوْا ذَرْوًۢاۤیْ خٰیْرًا؟**^{۱۲}

جاوید غامدی صاحب نے لکھا تھا کہ جزل ضیاء الحق ”اس قوم کی تاریخ میں ایک ایسا باب رقم کر رہے ہیں جو اس کے نصب العین کی تلاش میں اب ہمیشہ اُس کے لیے منبع الہام بنارہے گا“، لیکن سماء ٹی وی پر ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ”ہمیشہ“ کہاں، دس بارہ برس ہی میں یہ الہام، مغرب کی ”وحیِ خفی“ سے، منسوخ ہو گیا، اور ”صاحب الہام“ ایک قابلِ مذمت مجرم قرار پایا۔ تاریخ میں کسی ”منبع الہام“ کی ایسی رسوائی کم ہی ہوئی ہوگی۔ کیا جدید اسلام کے نزدیک ”الہام“ بھی اشیائے صرف کی نوعیت کی چیز ہوتی ہے؟ اور دینی آراء بھی؟ اپنی سابقہ دینی آراء کو مستور رکھنے کی اس کوشش میں دین کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہے؟

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟

مصلحتِ وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

دین کی جدید تعبیرات نصوص سے نہیں بلکہ نصوص کے خارج سے اٹھتی ہیں۔ سنہ ۲۰۰۱ء کے بعد جدید اسلام کو از سر نو ایک ”بیانیہ“ اور ایک تازہ دینی استدلال کی حاجت پڑی۔ جس افغان جہاد کو پہلے ”علم حق“ قرار دیا تھا اب اسے دہشت گردی سے ممیز کرنا تھا۔ شرط بہت کڑی تھی۔ یعنی یہ کہ نیا استدلال بھی پرانے فتوے کی طرح قرآن و سنت ہی کی ”نصوص“ پر استوار ہونا چاہیے۔ جب جدید اسلام کے ”ملا اعلیٰ“ سے ”جہاد“ کو ”دہشت گردی“ قرار دینے کا الہام سی این این کے ”ملائکہ“ کے ذریعے نازل ہوا،

۱۱۔ جاوید احمد غامدی، ”مذہبی انتہا پسندی“، سنہ ۲۰۱۳ء۔

۱۲۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا!

تو ایک مرتبہ پھر لبرل اسلام ہی کام آیا۔ چنانچہ فوراً اس مزاحمت کو ”دہشت گردی“ قرار دینے کا فتویٰ صادر ہوا^{۱۳}۔ جاوید غامدی صاحب نے جن مجاہدین کو ”قافلہ حق“ قرار دیا تھا، اب انہی مجاہدین کی مذمت میں کلامِ بلیغ جاری ہوا۔ فرماتے ہیں: ”جن لوگوں نے اس طرح کی پالیسیاں بنائیں ان کی مذمت کی جانی چاہیے۔“ اس مرتبہ قرآن و حدیث کی کچھ اور ”نصوص“ کام میں لائی گئی ہوں گی، لیکن ان نو دریافت شدہ ”نصوص“ کا اثر بالکل متضاد تھا۔ ضیاء الحق کے عہد میں ”نصوص“ کا تقاضا یہ تھا کہ ”فرزندِ انِ لینن“ کے خلاف مزاحمت کرنا جہاد ہے۔ اب کچھ اور ”نصوص“ جدید اسلام کی زنبیل میں ہاتھ ڈال کر نکالی گئیں، جن کی روشنی میں امریکی اور یورپی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت ”دہشت گردی“ قرار پائی، اور یوں اکیسویں صدی کے ایک اور ”بطلِ جلیل“ (یعنی جنرل پرویز مشرف) کی پالیسی عین اسلام ثابت ہو گئی^{۱۴}۔ ہمارا گمان ہے کہ اگر جاوید غامدی صاحب کے خیال میں جنرل ضیاء الحق کی شہادت پر ”عصمتِ جبریل“ گواہ تھی، تو جنرل پرویز مشرف کی معزولی^{۱۵} پر انہیں کم از کم عصمتِ میکائیل کی گواہی تو ضرور ملی ہو گی! اور خواہ پہلا بطلِ جلیل ہو یا دوسرا۔ دونوں مرتبہ آں جناب کے فتوؤں سے ایک ہی بات ثابت ہوئی: جدید اسلام کی ”شریعت“ میں ”حق“ ہمیشہ امریکہ و مغرب کی ساتھ ہی ہوتا ہے! اس طرح ”حق“ کی ترجیحات بھی قطعیت کے ساتھ طے ہو گئی ہیں!

ان ”نصوص“ میں ایک اور ”کرامت“ بھی ہے۔ قرآن و حدیث کی ”نصوص“ خواہ نئی ہوں یا پرانی، اور یہ متجددین اُن کے ذریعے، ایک ہی شے کو، خواہ کبھی ”جہاد“ اور کبھی ”دہشت گردی“ قرار دیں، لیکن بہر صورت مغربی قوتیں ہی برسرِ حق قرار پاتی ہیں! یہ بات دلچسپ ہے کہ جدید اسلام کی دینی تعبیرات اور اجتہادات ہمیشہ جدیدیت کے حق میں ہی پڑتے ہیں۔ غالباً جدید اسلام اس سے قرآن و حدیث کا ”اعجاز“ ثابت کرنا چاہتا ہے! دونوں فتاویٰ میں کوئی دس برس کا وقفہ ہے۔ جدید اسلام کی ”جدیدیت“ کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ، نصوص کی تعبیرات بھی بدلتا رہتا ہے! شاید اس طرح یہ لوگ اسلام کے ہر دور میں قابلِ عمل ہونے کا مقدمہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں! یہ سب

۱۳۔ علامہ اقبال کہتے ہیں: ”تو بدل گیا تو بہتر، کہ بدل گئی شریعت / کہ موافق تدریجاً نہیں دینِ شاہبازی۔“

۱۴۔ اپنے ایک حالیہ مضمون میں غامدی صاحب نے اسلام کو ریاست کے آگے بے دست و پا کرنے کے لیے ایک بیانیہ جاری کیا ہے۔ اس میں ابتدا ہی مدرسوں کے خلاف قراردادِ جرم سے کی ہے، کہ ان مدارس نے بہر حال اسلام کے عقیدہ جہاد کو شامل نصاب رکھا ہوا ہے۔ غامدی صاحب کا مدارس اور علماء کے خلاف غصہ بے سبب نہیں ہے۔ برسوں پہلے علامہ اقبال نے اپنی نظم ”ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام“ میں شیطان کا یہ قول منظوم کیا تھا:

افغانیوں کی غیرت دیں گا ہے یہ علاج

ملا کو ان کے کوہ و دامن سے نکال دو

۱۵۔ پرویز مشرف کی معزولی جاوید غامدی صاحب کی نظر میں ”شہادت“ سے کیا کم ہو گی؟ لیکن افسوس کہ اس ”بطلِ جلیل“ کی معزولی پر جاوید غامدی صاحب کا کوئی مرثیہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

کمالات ان کے سامعین کو تسلیم ہیں، لیکن کبھی کبھی ان بے چارے سامعین کے سامنے یہ سوال ضرور کھڑا ہوتا ہے کہ جدید اسلام کی ”نصوص“ اور موم کی ناک میں کیا فرق ہے؟

لیکن ”نصوص“ کی یہ تکرار کیوں ہو رہی ہے؟ جاوید غامدی صاحب کے اس بیانیے میں تو سرے سے قرآن و حدیث کی کوئی نصوص پیش ہی نہیں کی گئیں؟ عرض ہے کہ اس کے لیے قرآن و حدیث کی ”نصوص“ ضروری بھی نہیں ہیں، اور اگر کسی کو بہت شوق ہے تو تلاش کرنے سے کچھ ”نصوص“ ان کی کسی تحریر میں ضرور مل جائیں گی۔ بظاہر حالیہ تقریر میں انہوں نے کسی ”نص“ کا براہ راست کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لیکن ذرا رُکے۔ کیا ایسا ہی ہے؟ کیا انہوں نے اس تقریر میں کسی ”نص“ سے استشہاد نہیں کیا؟ جاوید غامدی صاحب کے اس مختصر بیان میں تلاش ”نصوص“ کے لیے مکرر نظر ڈال کر دیکھیے، امید ہے آپ کی نظر ناکام و نامراد واپس نہیں آئے گی، اور آپ کو ایک جلی ”نص“ مل جائے گی۔ چنانچہ جاوید غامدی صاحب کے الفاظ ہیں:

”میں نے اپنے کانوں سے یہ سنا ہے کہ بلیری کلنٹن نے کہا کہ [افغان جہاد میں] ہم سے غلطی ہوئی۔“

گویا جاوید غامدی صاحب فرما رہے ہیں: ہمارے ہاں امریکہ کی ”حاکمیت“ قائم ہے، لہذا یہ ”نص“ فیصلہ کن ہے اور قطعی الدلالہ ہے۔ اور چونکہ میں نے اسے ”اپنے کانوں سے سنا ہے“ لہذا قطعی الثبوت بھی ہے۔ اس ”نص“ کے بعد اُس افغان جہاد کے جرم ہونے میں فقط ضعیف العقیدہ متجددین ہی کو شک ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ کو اب بھی شک ہے، تو یہ انتہائی تشویش کی بات ہے۔ آپ جدید مسلمان (Modernist Muslim) نہیں ہو سکتے جب تک آپ کھلے دل سے اور کامل اخلاص سے ان معزز امریکیوں کو اپنے تمام معاملات میں فیصلہ کن حاکم تسلیم نہ کر لیں، اور پھر اس عقیدے پر استقامت کے ساتھ قائم بھی رہیں۔ جس نے ایسا کیا اس نے جدید لبرل اسلام کا ذائقہ چکھ لیا۔ احتیاطاً، خود احتسابی کے لیے ذرا قلب میں جھانک کر دیکھیے، کہیں خدا نخواستہ آپ امریکہ کی وزیر خارجہ کی بات پر دل میں کسی قسم کی ناگواری تو محسوس نہیں کر رہے؟ کیونکہ ان کے فیصلے پر تو دل میں ناگواری محسوس کرنے سے بھی دُنیا کے تمام مفادات ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے!

بلیری کلنٹن کے اس اعتراف۔ یعنی جدید اسلام کی اس ”نص“۔ کی بھی کئی برکات ہیں۔ روایت یہ رہی ہے کہ اگر آپ سے کوئی سیاسی و علمی غلطی ہوئی ہو، جس کے نتیجے میں بقول خود یہ ملک ”دہشت گردوں کی جنت“ بن گیا، اور ”ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں“، تو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قوم سے معذرت کریں۔ جنرل ضیاء الحق کی جہادی کاروائی کی اگر آپ نے علانیہ تائید کی تھی اور اس پر شعروں میں خراج تحسین پیش کیا تھا، تو کم از کم پاکی داماں کی حکایت کو اتنا نہ بڑھائیں، اور

بقول خود افغان جہاد کی وجہ سے جو خون آج بہہ رہا ہے، اس کی کم از کم جزوی ذمہ داری ہی قبول کریں! کاش وہ یہ جرات فرماتے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

تاہم بے سبب سوء ظن سے پرہیز کرنا چاہیے۔ حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ ہلیری کلنٹن کے بیان کو جاوید غامدی صاحب کی جانب سے بھی ندامت کا اعتراف سمجھنا چاہیے۔ اگر ہلیری کلنٹن نے ”افغان جہاد“ کی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے، تو جاوید غامدی صاحب اس سے اختلاف کب کر سکتے ہیں؟ اس طرح وکالتا ان کی جانب سے بھی یہ اخلاقی فرض ادا ہو گیا ہے۔ ہلیری کلنٹن کے اس اعتراف کو سامعین کے سامنے بیان کرنے کی ایک غرض یہ بھی ہو سکتی ہے کہ واضح کیا جائے کہ گویا جاوید غامدی صاحب نے بھی اپنی غلطی کا وکالتا ہی سہی۔ اعتراف تو کر لیا ہے۔ حاکم و محکوم کا ایک دوسرے پر اتنا حق تو ہوتا ہی ہے!

آراء بدلنے کا اختیار ہر صاحبِ قلم کو ہے۔ لیکن اس میں اگر علمی دیانت داری کا لحاظ نہ رکھا جائے تو یاد ماضی عذاب بن جاتی ہے۔ اوپر نقل ہوا ہے کہ گزشتہ سال جب ایک سائل نے مطالبہ کیا کہ: ”جنہوں نے افغان جہاد کی سرپرستی کی اور قبائلی علاقے کے لوگوں کو استعمال کیا ان لوگوں کو سزا دی جائے۔“ تو اس پر جاوید غامدی صاحب نے جواب دیا: ”مجھے سو فیصد اتفاق ہے، وہ سرتاسر مجرم ہیں،“ اور مزید فرمایا کہ ”میں نے اُس زمانے میں بھی شدت کے ساتھ اس طرف توجہ دلائی تھی“۔ سنہ ۱۹۸۸ء میں ان کی محولہ بالا تحریر سے واضح ہے کہ یہاں صداقت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ وہ یہ جواب دیتے:

میں بھی مجرم ہوں، میں نے اس وقت افغان جہاد کے سپہ سالار کو خراج تحسین پیش کیا تھا، اسے ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا پہلا تیر قرار دیا تھا، اور اس کے حق میں دینی فتاویٰ جاری کیے تھے، اور شرمندہ ہوں کہ فرط جذبات میں مجھ سے کچھ شاعری بھی سرزد ہو گئی تھی، چنانچہ اس اعتبار سے بالواسطہ افغان جہاد کی سرپرستی میں شریک تھا۔ مجھے صدر ضیاء الحق کی بعض باتوں سے اختلاف تھا، لیکن جہادِ افغانستان کو میں اُن کی ”استقامت اور پامردی“ کی روشن مثال سمجھتا تھا اور اس میں انہیں حق کا علمبردار سمجھتا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا ذمہ دار فقط اس وقت کے حکمران اور دینی مدارس نہیں ہیں، بلکہ میں بھی کسی حد تک اس کا ذمہ دار ہوں۔ یہ ”دہشت گردی“ فقط دینی مدارس ہی کا ”مولودِ فسانہ“ نہیں ہے، بلکہ میری مضطرب شاعری و صحافت کا ”مولودِ فسانہ“ بھی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ میری رائے اب تبدیل ہو گئی ہے۔ اب میں اُس ”جہاد“ کو ایک جرم سمجھتا ہوں۔ میں شرمندہ ہوں اور قوم سے معذرت کرتا ہوں۔

لیکن اس کی بجائے، اپنی سابقہ تحریر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اس وقت

بھی کہا تھا کہ ”ہم اپنی قبر کھود رہے ہیں“ اور ”اپنے وجود میں بارود بھر رہے ہیں“ اور ”میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں“ وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جاوید غامدی صاحب صدر ضیاء الحق کے زمانے میں اس کام کو ”جہاد“ سے تعبیر کر رہے تھے، اور نہ صرف انہوں نے صدر ضیاء الحق کے اس اقدام پر کسی نوع کی تنقید نہیں کی تھی، بلکہ انہیں خراج تحسین پیش کرتے رہے۔ بات تو رسوائی کی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس وقت فرط جذبات میں آں جناب نے سوز و درد میں ڈوبی کچھ شاعری بھی فرمائی تھی! چونکہ شاعری کا ذکر آگیا، موضوع بھی افغان جہاد ہے، اور شاعر۔ یعنی جاوید غامدی صاحب۔ کو شبلی نعمانی کے ”دبستان“ سے نسبت پر ناز بھی ہے^{۱۶}، تو افغان مزاحمت پر شبلی نعمانی کے چند اشعار یاد آ گئے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل، انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا اور قندھار کو فتح کیا، تو شبلی نعمانی نے غالباً کسی ”انگریز افسر کو خوش کرنے کے لیے“^{۱۸} ایک قصیدہ کہا، تاکہ اُن پر استعمار کے حق میں قصیدہ خوانی کا الزام محض مجاز نہ رہ جائے۔ اس کا ایک بند یہ ہے:

لو سُنو تیغ و سناں کی داستان

رایت و طبل و نشان کی داستان

پہلوانانِ جہاں کی داستان

شاہ کے اعزاز و شاں کی داستان

حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے!

قیصرِ ہندوستان کی فتح ہے!

اس قصیدے میں افغانوں کی شکست پر شبلی کی مسرت اور انگریزی استعمار سے ان کی مخلصانہ الفت کے جذبات اُبلے پڑ رہے ہیں۔ اس میں ”حکمرانِ بحر و بر“، ”شاہ“ اور ”قیصرِ ہندوستان“ سے مراد تاجِ برطانیہ ہے۔ اقبال نے کہا تھا: ساحرِ انگلیں! مارا خواجہ دیگر تراش! سو فرق صرف یہ ہے کہ اب اسی برطانوی استعمار کا جانشین، خواجہ نو۔ امریکہ۔ آج کا ”قیصرِ بحر و بر“ ہے، جس کے خلاف مزاحمت کاروں کو ”دہشت گرد“ قرار دے کر، جاوید غامدی صاحب ”دبستانِ شبلی“ کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں، اور اس عظیم روایت کو قائم رکھنے کی تگ و دو میں، اپنے سابقہ دینی موقف کو مستور رکھنے کی غرض سے، علمی دیانت کی حدوں

۱۶۔ دیکھیے جاوید احمد غامدی، مقامات (لاہور: المود، ۲۰۰۸ء)، ۵۴، جس میں لکھتے ہیں ”آنے والے دور کی امامت دبستانِ شبلی کے لیے مقدر ہے“ (صفحہ: ۶۰)۔ گویا، اگر زندگی رہی تو آنے والے دور میں استعمار کے حق میں ایسے قصائد مزید سننے کو ملیں گے!
۱۷۔ غالباً یہ دوسری افغان جنگ تھی جو سنہ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک جاری رہی۔ تقریباً دس ہزار انگریز فوجی ہلاک ہوئے۔ قندھار سنہ ۱۸۸۰ء کے ستمبر میں فتح ہوا۔ شبلی نے جنگ کے بعد، یعنی سنہ ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ یہ قصیدہ کہا ہو گا جب ان کی عمر چوبیس پچیس برس کی ہوگی۔ اس کے معاً بعد، سنہ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں ملازمت مل گئی۔
۱۸۔ دیکھیے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، سنہ ۱۹۷۱ء)، ۷۴۔

کو بھی پار کر رہے ہیں^{۱۹}۔ اب ماضی میں جہاد کے حق میں دیے گئے اپنے فتاویٰ کی یاد بھی اُن کے لیے اس قدر خجالت کا باعث ہے، کہ اسے اپنے اور قوم کے حافظے سے کھرچ دینے کا سودا ہو گیا ہے۔ سر سید احمد خاں، جو اس دبستان کے اصل بانی ہیں، ہمیں ان سے ہزار اختلاف ہیں، ان کے ہاں سے ہی تہذیبی الحاد کی ابتدا ہوئی، لیکن ان کی دیانت بے داغ تھی اور خلوص ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ صد حیف! سید صاحب سے غامدی صاحب تک آتے آتے، فلک نے جدید اسلام کے خانوادے کا کیا حال کیا ہے!

ہمارے متجددین کی ”علمی دیانت“ کے اس الم ناک واقعے سے اس امر کی مزید شہادت ملتی ہے کہ ”جدید اسلام“ کا قرآن و سنت کی نصوص سے تعلق ایک instrumental جہت رکھتا ہے۔ ماڈرن اسلام فی الواقع حالات کے تابع ہے، اور زمانے اور قوت سے سازگاری پیدا کرنا اس کی سرشت میں ہے، کہ اس نے غلامی کی گود میں آنکھ کھولی اور جدیدیت کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا۔ یہ فکر از سر تا پا، استعمار کا ”مولود فلسفہ“ ہے۔ جدید اسلام کے ”علوم“ بے روح کھپتیلیاں ہیں اور ان کی ڈور جدید قوت کے ہاتھ میں ہے۔ اس فکر کی تہہ میں ارادہ کم اور زمانے کا جبر زیادہ فعال ہے۔ دینی و ملی معاملات کو ان متجددین کے ہاتھوں میں دینے کے نتائج کس قدر ہولناک ہو سکتے

۱۹۔ راقم نے شبلی کے استعماری رجحان کے موضوع پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا (دیکھیے ”استعماریت اور شبلی کی سیرت نگاری“، سہ ماہی جی، جلد ۸، صفحات ۶۰ تا ۱۰۱)۔ ”دبستانِ شبلی“ کے کسی اہل قلم کی جانب سے اس پر براہِ راست تو کوئی کلام نہیں ہوا، البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل سنہ ۲۰۱۵ء کے ماہنامہ ”اشراق“ میں جاوید غامدی صاحب کے ایک محترم شاگرد نے ”دبستانِ شبلی“ ہی کو مرذود قرار دے دیا ہے، اور خبر دی ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے شبلی کے ”انقلابی بیانیے“ کو ”قرآن و سنت“ کی رُو سے غلط ٹھہرایا ہے، اسے شبلی کی ”اپنی رائے“ قرار دیا ہے، اور شبلی کے بیانیے پر اصرار کرنے والوں کو ”طرزِ کہن پہ اُڑنے“ کا الزام دیا ہے۔ اس ”دبستان“ کی کسمپرسی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقط ایک تنقیدی مضمون کے نتیجے میں، دبستانِ شبلی کے چوتھے طبقے کے ایک اہل قلم نے، اپنے ”دبستان“ کے بانی ہی کو اس منصب سے برخاست کر دیا ہے! صورتِ حال کی سنگینی دیکھیے کہ ان کے استاد جاوید غامدی صاحب فرماتے ہیں: ”آنے والے دور کی امامت دبستانِ شبلی کے لیے مقدر ہے“ (مقامات، صفحہ ۶۰)، اور ان کے شاگرد فرما رہے ہیں: کہ شبلی کے بیانیے کا دور ختم ہو گیا! (اشراق، اپریل ۲۰۱۵ء، صفحات ۳۶ تا ۴۰)۔ پھر سر سید اور شبلی کو ”انقلابی“ قرار دینا بھی کیا خوب ہے! سر سید احمد خاں کے ”انقلابی“ ڈسکورس کے لیے تو محمد دین جوہر کا مضمون بعنوان ”سر سید احمد خاں“ ہی انشاء اللہ شافی ہو گا (سہ ماہی جی، جلد ۸، صفحات ۱۳ تا ۵۹)۔ اور شبلی کے ”انقلابی“ جذبے کے ثبوت کے لیے ان کے وہ اشعار ہی کافی ہیں جو ابھی نقل کیے گئے۔ ظاہر ہے شبلی نے ”قیصر ہندوستان کی فتح“ پر جو قصیدہ موزوں کیا ہے، اس کے لفظ لفظ سے ان کا ”انقلابی“ جذبہ عکس رہا ہے! تنگنائے حاشیہ مانع ہے، ورنہ شبلی کی نظم و نثر سے اس قسم کے ”انقلابی“ بیانیوں کے ڈھیر لگائے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اگر غور کیجیے تو سچ تو یہ ہے کہ غامدی صاحب کا صدر ضیاء الحق کے افغان جہاد کے حق میں بیانیہ اس طائفہ متجددین میں نسبتاً سب سے زیادہ ”انقلابی“ نظر آئے گا! اور اگر سر سید اور شبلی ”انقلابی“ ہیں، تو مولوی چراغ علی، عبد اللہ چکڑالوی، مرزا غلام احمد قادیانی، حمید الدین فراہی، احمد الدین امرتسری، اور غلام احمد پرویز، اور ڈاکٹر فضل الرحمن کا کیا قصور ہے؟ جو معذرت خواہان اسلام، شبلی کو دبستانِ شبلی کی قیادت سے اس لیے معزول کر رہے ہیں، کہ انہیں ایک صدی بعد یہ معلوم ہو گیا ہے کہ شبلی ایک ”انقلابی“ تھے، اُن کی خدمت میں عرض ہے:

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کر گسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی!

ہیں؟ قوت کا دائرہ کار فقط حقائق کی تہذیب و تشریح تک محدود نہیں ہے۔ علاوہ اُن تین طریقوں کے جن سے، بقول مشل فوکو، قوت علم میں سفاکانہ تصرف کرتی ہے، اس کی کافرانہ اداؤں کی کچھ اور ہلاکت خیریاں بھی ہیں۔ ممانعت و تحریم اور انکار حقائق کے ساتھ، حقائق کو خاموش کر دینے کی استعداد لاریب اس کے بڑے ہتھیار ہیں۔ محترم احمد جاوید صاحب نے کہا تھا: ”ایسے ایسے اندھیرے ایجاد کیے جا رہے ہیں جن سے زمین تو کیا سورج کو بھی تاریک کیا جاسکتا ہے۔“ اس سے آگے بڑھ کر قوت کا طلسم یہ ہے کہ اس کے پاس نئے حقائق کو تخلیق کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا: یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت / جو کچھ ہے، وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد! مشل فوکو لکھتا ہے:

Il faut cesser de toujours décrire les effets de pouvoir en termes négatifs : il a “exclut,” il “réprime,” il “refoule,” il “censure,” il “abstrait,” il “masque,” il “cache.” En fait le pouvoir produit; il produit du réel; il produit des domaines d’objets et des rituels de vérité. L’individu et la connaissance qu’on peut en prendre relèvent de cette production.

قوت کی توصیف کرتے ہوئے، ہمیں بلاتا خیر، ہمیشہ کے لیے، سلبی اندازِ بیان کو ترک کر دینا چاہیے، اور ایسے اسالیب استعمال نہیں کرنے چاہئیں کہ قوت ”مانعائی“ ہوتی ہے، ”دبا دیتی ہے“، ”سنسر“ کرتی ہے، ”تجرید“ کرتی ہے، ”پردہ ڈالتی ہے“، یا ”اخفاء“ کرتی ہے۔ قوت دراصل تولید کا عمل ہے، یہ حقیقت کو جنم دیتی ہے، یہ اشیاء کی ایک دنیا تخلیق کرتی ہے، حتیٰ کہ سچائی کے مناسک کی خالق بھی ہے۔ [دورِ جدید کا] انسان، اور وہ معلومات جو انسان کے بارے میں ہمیں ملتی رہتی ہیں، اسی نوع کی پیداوار ہیں۔^{۲۰}

۲۰۔ دیکھیے:

Michel Foucault, *Surveiller et punir: Naissance de la Prison* (Paris: Gallimard, 1975), 196